



متفرقات

مفتی منیب الرحمن

جناب عبداللہ طارق سہیل نے 1970 کے قومی انتخابات سے لے کر 16 دسمبر 1971 کے لیے اور سقوط ڈھاکا کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس وقت کی سیاسی جماعتوں اور قومی اخبارات و جرائد کے کردار کو واضح کیا ہے کہ کس طرح ”حب الوطنی“ کے دلکش نعروں کی گونج میں پاکستان کو دو لخت کر دیا گیا۔ اس زمانے میں بی بی سی پل پل کی خبریں سن رہا تھا، لیکن ہمارے ہاں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے اور راوی چین لکھتا تھا، حتیٰ کہ سرکاری میڈیا نے شکست کے دلخراش منظر کو بھی ہندوستانی افواج کے ساتھ معاہدے کے تحت جنگ بندی سے تعبیر کیا تھا۔ عبداللہ طارق سہیل صاحب کا انداز تحریر دلکش ہے، ان کا مطالعہ وسیع ہے، ان کا طنز، استعارات، کنایات اور تشبیہات دلچسپ اور بامعنی ہوتی ہیں، ان کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف ہر ایک کا حق ہے۔

انہوں نے لکھا: ”صرف نیپ اور بے یو آئی نے پاکستان توڑنے کی سازش کا ساتھ نہیں دیا اور مطالبہ کرتے رہے کہ جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کو اقتدار منتقل کیا جائے“۔ ان ایام میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اعلان کیا تھا: ”مغربی پاکستان سے جو رکن اسمبلی مشرقی پاکستان جائے گا، اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی“۔ مغربی پاکستان میں عدم مقبولیت اور مشرقی پاکستان میں جان کا خطرہ مول لے کر جو چند افراد تمام جہت کے لیے ڈھاکا گئے، ان میں جمعیت علمائے پاکستان کے صدر علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی مرحوم بھی تھے۔

1970 میں کراچی کے گلی کوچوں میں باشتنائے تعصب و تشدد جماعت اہلسنت کی مقبولیت کا عالم پندرہ بیس کے فرق کے ساتھ ایسا ہی تھا، جیسا کہ بعد میں لوگوں نے ایم کیو ایم کا دیکھا، گلی گلی دفاتر تھے۔ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے دورہ مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے لوگوں نے خوف سے اپنے دفاتر بند کر دیے کہ نفرت کا نشانہ بنیں گے، پنجاب میں ہمارے کئی سرکردہ علماء و مشائخ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی سے نفرت کی حد تک مخالفت پر اتر آئے تھے۔ اس کا سبب بدینیتی اور ذاتی عناد نہیں تھا، بس سرکاری اور نجی ذرائع ابلاغ قوم کے ذہنوں میں یہی انڈیل رہے تھے کہ آنکھیں بند کر کے جنرل یحییٰ خان کی حکومت کی حمایت ہی حقیقی ”حب الوطنی“ ہے اور جو اپنی دیانت و بصیرت کے مطابق ایسا نہیں کرتا، وہ بھارتی ایجنٹ، غدار وطن اور دشمن کے ہاتھوں بکا ہوا ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے دامن پر کوئی داغ اور دھبہ نہیں تھا، آج تک بدترین مخالف بھی ان پر کوئی الزام نہیں لگا سکا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت میں ارکان پارلیمنٹ کو ٹیوٹا کرولا کے پرمٹ دیے جاتے تھے، چونکہ یہ پالیسی کے تحت تھا، اس لیے اس پر کرپشن کی پھبتی بھی نہیں کسی جاتی تھی۔ کراچی میں جام صادق علی صاحب ریویزیوں کی طرح پلاٹ بانٹ رہے تھے، بعد میں جو بنجودور میں اسلام آباد میں بھی ارکان پارلیمنٹ کو پلاٹوں کی الاٹمنٹ شروع ہوئی۔ لیکن علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے کارکا پرمٹ اور پلاٹ کچھ بھی نہ لیا اور نہ کوئی اور منفعت حاصل کی۔ حال ہی میں ایک اخبار میں مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرط محبت میں جناب صہیب مرغوب نے لکھا: ”مولانا نورانی نے کارکا پرمٹ جمعیت علمائے پاکستان کے نام کر دیا تھا“، یہ قطعاً درست نہیں ہے، مولانا نے بعض لوگوں کے مشورے کے باوجود کارکا پرمٹ نہیں لیا تھا، ریکارڈ اس پر شاہد ہے۔ وہ فقیر منش انسان تھے، مرد قلندر تھے، متوکل علی اللہ تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ”غنائے نفس“ سے نوازا تھا۔ جناب حاجی حنیف طیب راوی ہیں: ”چائے کے وقفے میں پارلیمنٹ ہاؤس میں پارلیمنٹیرین چائے پیتے تھے، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی ٹیبل پر سردار شوکت حیات اور دیگر جاگیردار ارکان اسمبلی آ بیٹھے، وہ سب اہل ثروت تھے، لیکن بل آیا تو علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے ادا کر دیا اور ان کے پاس اس وقت کل سرمایہ یہی تھا۔“

الغرض پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے پر علامہ شاہ احمد نورانی پر طنز و طعن کے تیر برسائے گئے کہ مشرقی پاکستان سے پان کے ٹوکرے لے کر آئے ہیں، کارٹون بنائے گئے، انہوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، لیکن اللہ تعالیٰ، اپنے ضمیر اور تاریخ کے آگے اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کیا اور پاکستان توڑنے میں حصہ دار نہیں بنے۔ یہ سب کچھ میں تاریخ کا ریکارڈ درست کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں، کیونکہ میں شعوری طور پر اُس دور کے قومی اخبارات اور جرائد ”چٹان“، ”اردو ڈائجسٹ“، ”زندگی“، ”لیل و نہار“ اور ”الفتح“ کا بھی مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ جب مشرقی پاکستان میں اسمبلی کی جعلی رکنیت ریویزیوں کی طرح بٹ رہی تھی، وہ منظر ذہن میں آج بھی تازہ ہے۔ میں کبھی بھی جمعیت علمائے پاکستان کا باضابطہ رکن نہیں رہا، صرف علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی سے ان کے پاکیزہ کردار کی وجہ سے عقیدت اور باہمی احترام کا ایک تعلق تھا، جو آخر دم تک رہا۔

تحریک لبیک پاکستان: تحریک لبیک پاکستان نے لاہور کے بعد پشاور میں بھی اپنی سیاسی اور انتخابی اہلیت کو ثابت کیا ہے، پشاور کی سرزمین تو ان کے لیے اس حوالے سے بالکل نئی تھی، ہو سکتا ہے اس میں ان کے امیدوار جناب ڈاکٹر شفیق امینی کی صلاحیتوں کا بھی دخل ہو۔ میڈیا کے بعض حلقوں نے اس تنظیم کا ذکر شدت پسندوں میں کیا ہے، میری معلومات کے مطابق تاحال ان کے کھاتے میں نہ کوئی شدت پسندی ہے اور نہ ہی کسی فساد سے ان کا تعلق رہا ہے، البتہ شروع میں سیاسی تجربہ نہ ہونے کے سبب ان سے کچھ بے تدبیریاں ہوئیں، لگتا ہے اب وہ اس پر قابو پا رہے ہیں۔ آپ اسے اہلسنت کی ایک مصلحت سیاسی جماعت قرار دے سکتے ہیں اور اس کی اٹھان بھی اسی حوالے سے ہے۔ میں تو سوشل میڈیا استعمال نہیں کرتا، لیکن بعض دوستوں نے بتایا کہ سیاست میں آنے کے بعد علامہ خادم حسین رضوی کے لب و لہجہ میں کافی بہتری اور شائستگی آ گئی ہے اور یہ لائق تحسین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کے بھی حافظ ہیں، اردو خطابت کی اثر آفرینی اور لذت افزائی کے لیے علامہ اقبال کی شاعری سے بہتر مصالحوں کوئی نہیں ہے۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیلف میڈ ہیں اور ان کی علمی و سیاسی وجاہت میں کسی صاحبزادگی کا سابقہ شامل نہیں ہے۔ تاوقتیکہ کوئی متفقہ قومی میثاق مرتب نہ ہو، دھرنے اور ریلیاں اب ہمارے مذہبی



ویسی کچھر کا لازمہ بن گئی ہیں، اس کے لیے کسی ایک طبقے کو ملامت کرنا درست نہیں ہے۔ میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ جب تک ہر حکومت وقت پر امن طریقے سے شکایات کے ازالے کے شعرا کو نہیں اپنائے گی، احتجاج کے کچھر کو ختم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔

وضاحت: علامہ ڈاکٹر آصف اشرف جلالی کے حلقہ ارادت سے تعلق رکھنے والے ایک مہربان نے ”السیف المسلمول“ کے مجاہدانہ نام سے لکھا ہے: ”مفتی صاحب سیاست سے فرصت مل جائے تو ختم نبوت مارچ پر بھی لب کشائی فرمائیں۔“ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم آپ کی کامیابی اور سرخروئی کے لیے دست بدعا ہیں، جو لوگ اس قافلے میں شریک ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ماجور فرمائے۔ اس عنوان پر میں اپنی فہم کے مطابق اپنا موقف تین کالموں میں لکھ چکا ہوں، جب کوئی اور بات سامنے آئے گی تو ضرور اظہار خیال کروں گا۔ ہمیں ان رہنماؤں کے اخلاص کا پورا یقین ہے، ان کے مطالبات کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ یہ حضرات اچانک کسی احتجاجی پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں، اہل دانش کا طریقہ رہا ہے کہ گزشتہ تجربات سے سبق حاصل کر کے آئندہ کی حکمت عملی مرتب کرتے ہیں تاکہ پہلے سے بہتر نتائج نکلیں۔ مجھ سے وزیر داخلہ جناب احسن اقبال کے دفتر سے بدھ کے دن ایک بار رابطہ قائم کیا گیا کہ میں جمعرات کو صبح دس بجے اسلام آباد آ جاؤں۔ میں نے ان سے معذرت کی، کیونکہ نہ تو میں حکومت کا نمائندہ ہوں اور نہ ہی ”تحریک لبیک یا رسول اللہ ﷺ“ کی طرف سے میرے پاس کوئی مینڈیٹ یا نمائندگی کا حق ہے۔ اُن کی اپنی مذاکراتی ٹیم موجود ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مذاکرات میں مصروف ہے اور یقیناً اُن کے پاس معاملات کو طے کرنا کا اختیار بھی ہوگا۔ لہذا حکومت کے ذمے داران کو چاہیے کہ براہ راست ان سے مذاکرات کریں اور احسن طریقے سے معاملے کو انجام تک پہنچائیں۔ ہماری خواہش اور دعا ہے کہ پر امن طریقے سے یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو اور اللہ کرے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہو، کیونکہ ملک انتہائی نازک حالات سے دوچار ہے اور کسی بھی ایسی صورت حال کا متحمل نہیں ہے جو داخلی انتشار یا عدم استحکام پر منتج ہو۔

بچپن سے ایک مقولہ سنتے چلے آ رہے ہیں: ”مصیبت اکیلے نہیں آتی“، سو اس حکومت پر بھی مصیبتیں پے در پے نازل ہو رہی ہیں، دانشمندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے، لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ رانا ثناء اللہ صاحب کے بارے میں میں پہلے ہی اپنا موقف لکھ چکا ہوں: ”ان کے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ ساء ٹیلی ویژن چینل پر ندیم ملک صاحب کے پروگرام میں جو الفاظ انہوں نے استعمال کیے، کسی توجیہ، تاویل یا بہرہ پھیری کے بغیر غیر مشروط طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کریں اور اس کے حبیب مکرم ﷺ سے معافی کی التجا کریں، مسلمانوں کے جذبات کو انہوں نے مجروح کیا ہے، اس پر ان سے معافی مانگیں۔“ لیکن آج 2 نومبر تک انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ لاہور میں ہمارے علماء علامہ غلام محمد سیالوی، صاحبزادہ محمد عبدالمصطفیٰ ہزاروی، ڈاکٹر راغب حسین نعیمی و دیگر حضرات وزیر مملکت برائے مذہبی امور جناب پیر امین الحسنات شاہ کی موجودگی میں وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف کو اپنی تائید کے ساتھ میرا یہ موقف بتا چکے ہیں، اس محفل میں رانا ثناء اللہ بھی موجود تھے، عمل درآمد کا وعدہ بھی کیا، لیکن جب بد قسمتی اور نحوست غالب آ جائے تو دودھ میں میٹنگیاں ڈالنے بغیر لوگوں کو چین نہیں آتا، ان پر انا غالب آ جاتی ہے، جبکہ مصیبت سے نجات کا واحد راستہ تجر و انکسار اور شریعت کے مطابق غلطی کی تلافی ہے۔



متفرقات

مفتی منیب الرحمن

اردو زبان: جناب عبداللہ طارق سہیل نے درست لکھا ہے کہ جو مہارت، قرینہ اظہار اور بے ساختہ پن اہل زبان کے کلام میں ہوتا ہے، وہ دوسروں کے حصے میں کیسے آ سکتا ہے، کیونکہ علمی زبان میں ایک گونہ تکلف جبکہ مادری زبان کے اظہار میں بے ساختہ پن ہوتا ہے اور دونوں کی تاثیر میں فرق لازمی ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کن کے لہجے اور محاورے میں اختلاف کی بازگشت سنائی دیتی رہی ہے۔ لیکن اگر حقیقت پر مبنی بات کی جائے تو یہ المیہ ہے کہ آج اہل زبان اردو اسپیکنگ رہ گئے ہیں، اردو خواں اور اردو لکھاری کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لاہور کی پنجابی زبان کی طرح اہل کراچی کی اردو زبان بھی خالص نہیں رہی، انگلش میڈیم تعلیم، میڈیا، ہندوستانی فلموں اور ڈراموں کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔

میں نے ایک مرتبہ آرٹس کونسل کراچی کے ایک سیمینار میں کہا تھا: ”اردو والو! ڈرو اس وقت سے جب آپ اپنے بچوں کو اردو لکھانے اور پڑھانے کے لیے لاہور سے اساتذہ بلائیں گے“۔ آج اردو اخبارات میں بیشتر لکھاریوں اور کالم نگاروں کا تعلق لاہور و اسلام آباد سے ہے اور ان میں کئی ایسے ہیں جنہیں زبان و بیان پر بڑا عبور ہے، صاحب طرز ہیں۔ اردو شعراء بھی زیادہ وہیں پائے جاتے ہیں اور کتب بینی کے تَنَزُّل کے اس دور میں اردو کتابوں اور رسائل کی بڑی مارکیٹ بھی وہیں ہے۔ ان میں سے جنہیں اردو ادب کی مختلف اصناف پر عبور اور عربی و فارسی کالمس ہے، ان کی تحریریں دلکش ہوتی ہیں۔ عربی و فارسی کے کالمس کے بغیر اردو نثر و نظم میں وہ دلکشی اور تاثیر نہیں آ سکتی جو کلاسیکل شعراء اور نثر نگاروں کی تحریروں میں ہے۔ اگر ہم نے اردو زبان کے ایسے ماہرین پیدا کرنے ہیں جنہیں اردو کے کلاسیکل لٹریچر پر عبور ہو، تو میرا مشورہ ہے کہ اردو کے ایم۔ اے اور ایم فل کے نصاب میں ابتدائی عربی اور فارسی کی تعلیم بھی شامل کی جائے۔ اس سے میری مراد صرف ادبی سرمایہ ہی نہیں بلکہ اردو زبان میں ہمارا دینی سرمایہ بھی بے بہا ہے۔ ”کلاسیکل لٹریچر“ کی اصطلاح انگریزی میں رائج ہے، اردو میں اسے کسی تغیر و تبدل یا مَوَژ دیکھے بغیر قبول کر لیا گیا ہے، تاہم اس کا بہتر متبادل ”ادب عالی“ ہو سکتا ہے۔

جدید دور کی چکا چوند اور طلب معاش نے زبانوں کی ساخت کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ آفتاب رسالت طلوع ہونے کے زمانے تک مکہ مکرمہ کے خاندانی لوگ اپنے بچوں کو خالص عربی سکھانے، عربیت کے مزاج میں ڈھالنے کے لیے رضاعی ماؤں کے پاس بدوی معاشرت میں چھوڑتے تھے اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کا بچپن بھی اسی ماحول میں گزرا ہے۔ تاریخ ادب عربی میں عربی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے: (الف) شعراء جاہلیہ، (ب) مخضرمین، جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں شاعری کی، (ج) جو آفتاب رسالت طلوع ہونے کے بعد شعوری عمر میں داخل ہوئے، اسلام قبول کیا اور شاعری کی، (د) متولدین، وہ شعراء جو اسلامی تمدن کے ارتقا اور تہذیبوں کے اختلاط کے بعد بنو عباس کے دور میں معروف

ہوئے۔ بڑے شہروں اور تجارتی مراکز میں زبان خالص نہیں رہتی، اس میں غیر ارادی طور پر دوسری زبانوں کی اصطلاحات اور محاورات کی آمیزش ہو جاتی ہے، خالص عربیت کے لیے عہد جاہلیت کی شاعری کو آج بھی حجت مانا جاتا ہے، عربی کا مشہور شاعر متنبی کہتا ہے:

حُسْنُ الْحَضَارَةِ مَجْلُوبٌ بِطَرِيْقَةٍ وَفِي الْبَدَاوَةِ حُسْنٌ غَيْرٌ مَجْلُوبٌ
وَمِنْ هَوَى كُلِّ مَنْ لَمْ يَسْتَمْوِهَةً تَرَكْتُ لَوْنٌ مَشِيْبِي غَيْرٌ مَخْضُوبٌ

ترجمہ: ”شہری حسیناؤں کا حسن بناؤ سنگھار کا مرہون منت ہوتا ہے، جبکہ بدوی ماحول میں رہنے والوں کا حسن فطری ہوتا ہے، چونکہ میں میک اپ سے بے نیاز فطری حسن کا شیدائی ہوں، اس لیے حسینانِ فطرت کی محبت میں، میں نے اپنے بالوں کو خضاب لگانا بھی چھوڑ دیا ہے۔“ اہل زبان پنجاب کے ادباء اور شعراء کا کلام پڑھ کر مسحور ہوتے ہیں، لیکن بعض الفاظ کا تلفظ اور لہجہ اُن کی سماعتوں کو بھلا نہیں لگتا۔ ماضی میں ہم کراچی کے ادیبوں کے تبصرے سنتے تھے کہ جناب ابنِ انشاء کی تحریر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی لگتی ہے، لیکن لہجہ ٹھیکہ پنجابی ہے۔

جناب راحیل اظہر کا شکریہ: انہوں نے لکھا ہے: ”مفتی منیب الرحمن کے گزشتہ دو کالموں میں زبان کی کچھ غلطیاں تھیں، مثلاً: ”کے بجائے“ کی جگہ ”کی بجائے“، ”اس کے گھر پہنچا آئے“ کی جگہ ”اس کے گھر چھوڑ آئے“، ”اُن کی سوا مشکل ہے“ کی جگہ ”اُن کو سوا مشکل ہے“۔

میں نے نیٹ پر جناب انتظار حسین اور جناب وسعت اللہ خان کے کالموں میں دیکھا: انہوں نے ”ان کی سوا مشکل ہے“ ہی لکھا ہے، اس تصحیح پر جناب راحیل اظہر کا شکریہ۔ علامہ جاوید غامدی نے اپنی تفسیر میں ”ان کو سوا مشکل ہے“ لکھا ہے۔ ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 4، جلد: 99، میں مولانا نایاب حسن نے ”دینی و اصلاحی جلسے: چند قابلِ توجہ پہلو“ کے عنوان سے اپنے مضمون میں ”اُن کو سوا مشکل ہے“ لکھا ہے۔ اب جناب راحیل اظہر محارمہ کر کے فیصلہ فرمائیں کہ اُن کے بقول ہم سے جو ادبی گناہ سرزد ہوا ہے، اس کی سزا کیا ہے، کیونکہ اس گناہ کا ارتکاب کرنے والے دسیوں ہیں، میرے نزدیک معنوی طور پر دونوں کو درست ماننے میں حرج نہیں ہے اور ”کو“ ہمارے ذوقِ سماعت کو بھلا لگتا ہے، لیکن ہم نہ اہل زبان ہیں اور نہ اردو ادب پر اتھارٹی، بلکہ طفلِ مکتب ہیں۔

جہاں تک ”کے بجائے“ کی جگہ ”کی بجائے“ کا تعلق ہے، تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ میں بعض اصحابِ قلم کی اتباع میں ”کے بجائے“ ہی لکھتا رہا ہوں، لیکن ایک اہل زبان نے مجھے کہا: ”کی بجائے“ لکھنا چاہیے، اس کے بعد میں نے اسے اختیار کر لیا۔ اس سے پہلے میرے مطبوعہ کالموں میں ہر جگہ ”کے بجائے“ ملے گا۔ دراصل بجائے کے دو معنی ہیں: ”کی جگہ“ یا ”مبادل“، میری رائے میں اگر ”بجائے“ کو متبادل کے معنی میں لیا جائے تو ”کے بجائے“ مناسب ہے اور ”جگہ“ کے معنی میں لیا جائے تو ”کی بجائے“ مناسب ہے۔ ہم اردو کے طالب علم ہیں، ان میں سے کسی ایک کو اس درجے میں ترجیح دینا کہ اس کے متبادل کو غلط قرار دیا جائے، یہ اساتذہ کا منصب ہے۔ ”پہنچا آئے“ اور ”چھوڑ آئے“ میں معنوی فرق تو کوئی نہیں ہے، البتہ ”پہنچا آئے“ میں وضع داری زیادہ ہے، ہمارے زمانہ طالب علمی میں جب طلبہ کہتے: ”کتاب پڑی ہوئی ہے“، تو ہمارے استاذ گرامی ٹوکتے اور فرماتے: ”کتاب رکھی ہوئی ہے“، بولا کرو، کیونکہ پڑی ہوئی میں ذرا بے قدری کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ انگریزی میں

”بے قدری“ ہمیں قبول ہے، لفٹ مانگتے وقت ہم کہتے ہیں: ”آپ مجھے فلاں جگہ Drop کر دیں۔ ایک بار پھر جناب راحیل کا شکریہ۔“

میں نے گزشتہ کالم میں Spices کے معنی میں ”مصالحہ“ کا لفظ لکھا ہے، اردو میں ”مسالا“ بھی استعمال ہوتا ہے اور ”فیروز اللغات“ میں اسے عربی لفظ ”مَصَالِح“ کا مؤرّذ لکھا ہے اور اردو لغت بورڈ کی اردو لغت میں میم اور لام کی زیر کے ساتھ ”مَصَالِح“ لکھا ہے۔ عربی میں باب ”مُفَاعَلَه“ کے وزن پر مصدر مَصَالِح نہیں بلکہ ”مُصَالَحَه“ ہے، لیکن یہ Spices کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں: دو افراد کا باہم صلح کرنا یا اُن کے درمیان موافقت۔ جدید عربی میں مَصَالِح یا مَسَالِح Spices کے لیے ”بھار“ آتا ہے اور لام کی زیر کے ساتھ ”مَصَالِح“ عربی لفظ نہیں ہے، البتہ لام کی زیر کے ساتھ ”مَصَالِح“ باب مُفَاعَلَه کا اسم فاعل ہے۔

ذمے دار کون: الیکشن ایکٹ میں جو غفلت مجرمانہ کا ارتکاب کیا گیا ہے، اس کے بارے میں سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ ذمے دار کون ہے؟۔ یہ سوال اٹھانے والے پارلیمنٹ کے اندر بھی ہیں جو تمام مراحل میں اس ایکٹ کی تیاری اور منظوری کا حصہ بنے رہے اور پارلیمنٹ کے باہر احتجاج کرنے والے بھی ہیں۔ اس سوال کا دیا نندارانہ جواب صرف مولانا فضل الرحمن نے دیا ہے کہ ہم سب اس غفلت کے ذمے دار ہیں۔ مجھ سے ملاقات میں جماعت اسلامی کے جناب اسد اللہ بھٹو نے تسلیم کیا کہ ہم سے بھی کوتاہی ہوئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات وہ اپنے امیر کے منہ سے نہیں کہلواسکتے۔ الیکشن بل کی تیاری کے لیے ایک پارلیمانی کمیٹی بنی، پھر اس کی ذیلی کمیٹی بنی اور پھر یہ بل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے منظور ہو کر ایکٹ بنا۔ اس کا کافی حد تک ازالہ پارلیمنٹ نے کر دیا ہے اور کچھ حصے کا ازالہ باقی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا پارلیمانی کمیٹی یا اس کی ذیلی کمیٹی کے مسودہ قانون یا پارلیمنٹ کے منظور کردہ ایکٹ میں کسی فرد واحد کو ترمیم یا تفسیح کا اختیار ہے، اگر اس کا جواب اثبات میں ہے، تو ہمیں بتایا جائے کہ کس قانون کے تحت اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس کی ذمے داری پوری پارلیمنٹ پر عائد ہوتی ہے اور اُن میں بھی سب سے زیادہ اُن پر جو اسلام کے نام پر ووٹ لے کر آئے ہیں۔ ووٹ تو انہوں نے اسی لیے لیا تھا کہ ہم پارلیمنٹ کے اندر نفاذ اسلام کی کوشش کریں گے، وہاں اپنی ذمے داری پوری کرنے کی بجائے آپ روزانہ جلسوں سے خطاب فرمائیں، پریس کانفرنسیں کریں یا ٹیلی ویژن اسٹوڈیوز میں بیٹھے نظر آئیں، تو پھر قومی اسمبلی اور سینیٹ میں اپنے اُن افراد کو بھیجیں جو پارلیمنٹ کے اندر اپنے فرائض کو پوری تین دہائیوں سے انجام دے رہے ہیں، غفلت کا ارتکاب نہ کریں، جب آپ محض پروٹوکول اور مراعات کے لیے رکن بنیں گے اور پوری طرح فرائض انجام نہیں دیں گے تو اس طرح کی غفلتیں سرزد ہوں گی۔ کیا سب کو ذمے دار کے عنوان سے ایک ”تختیاتی ہیولی“ چاہیے کہ جس پر وہ سنگ باری کریں اور اسے قرار واقعی سزا دیں۔ تاحال انہوں نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ اُن کے ذہن میں اس غفلت مجرمانہ یا جرم صریح کی قرار واقعی سزا کیا ہے۔ اسلام آباد میں ایک کانفرنس میں این جی او کی ایک بیگم صاحبہ نے فرمایا: ”اسلام پر ہر کوئی بات کر سکتا ہے، ہم مثلاً کو اس کا ٹھیکیدار ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں“۔ تو میں نے اُن کی خدمت میں عرض کی: محترمہ! ہم ٹھیکیدار نہیں ہیں، چوکیدار ہیں اور چوکیدار کا کام یہی ہے کہ کوئی عمارت میں نقب لگانے آئے، تو اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا جائے۔